ہوتی جارہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا عشق و
ت کی سرمستی میں پابندیٔ شریعت اور اتباعِ سُنّت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے
م یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جارہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر
نے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیر و کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا، اور ع "بامسلماں اللہ اللہ با برہمن رام
م" پر عمل عام ہوگیا تھا نتیجۃً ملّتِ اسلامی کا جُداگانہ تشخّص ہی شدید خطرات سے دوچار ہوگیا تھا۔
علمائے ظاہر یا "حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین" کی جانب سے اس طرزِ عمل کی مخالفت
ک فطری امر تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بُغض اور عداوت
ں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش
علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے جس میں ایک بُعدِ رابع (FORTH DIMENSION)
ضافہ ہوگیا۔ اوائل عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیت کی درآمد سے جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا
یں کے زیرِ اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات و رسومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آگیا!
مسلم انڈیا کا سُنہرا دَور بلا شبہ اس کا صدرِ اوّل ہی تھا یعنی دَورِ خاندانِ غلاماں، جس میں
ت، احبار، رہبان کی تثلیث اگرچہ اصولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اس میں نہ تنزّل و انحطاط کے آثار
یاں ہونے تھے نہ باہمی بُغض و عناد کے بلکہ جیسا کہ اُوپر عرض کیا جاچکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق و
دن موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آجاتی ہیں لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرا
ال اور پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا
گیا بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اُترتی چلی گئیں ـــــ تا آنکہ مغل اعظم شہنشاہ
ر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی
نظ ہو کہ عین اُس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النہار پر
ت رہا تھا اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کس مپرسی کی حالت طاری ہوگئی! یہاں تک
م نہاد "دینِ الٰہی" نے دینِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اُسے
زمینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھالیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل
ن کے مطابق کہ جذر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مد کے آثار جنم لیتے ہیں

ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دور سرزمین پاک وہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا نقطۂ آغاز بن گیا، بقول علامہ اقبال ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغلِ اعظم علیہ ما علیہ کے آفتابِ اقتدار نے ابتدائی موانع و مشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا تھا[1] اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال و انحطاط کے دورِ سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے تحت سرزمینِ ہند میں دو خورشیدِ ہدایت بھی طلوع ہوئے: ایک مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (جن کا سنِ ولادت ۱۵۵۱ء ہے) جن کی مصلحانہ و مجددانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رُخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگزیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان ناصرالدین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اول و آخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو گئی۔

ان میں سے مقدم الذکر یعنی شیخ مجدد کی مساعی میں پُرجوش مجددانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخر الذکر یعنی شیخ محدث کی کوششوں پر خاموش مصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رُخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرت مجدد کی مساعی کو حاصل ہے جبکہ سرزمینِ ہند میں علمِ حدیثِ نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرت محدث نے سرانجام دی اس کے اثرات بہت دیرپا اور دُور رس ثابت ہوئے۔

حضرت مجددؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رُخ تصحیحِ عقائد، ردِّ بدعات، التزامِ شریعت اور اتباعِ سنت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے رائج الوقت علمی و نظری اور اخلاقی و عملی ہر نوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی، چنانچہ تردیدِ شیعیت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ "ردِّ روافض" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے

---

[1] اکبر کی حکومت کو استحکام ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد ہی حاصل ہوا تھا۔

تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی 'طریقت' اور 'شریعت' کے بُعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفۂ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود کی تدوین و ترویج ہے جس نے ان تمام مفاسد کا سدّباب کر دیا جو تصوف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے، نتیجۃً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتّباع کا جذبہ بھی از سرِ نو بیدار ہوا، فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ حاصل ہوا اور جذب و سکر اور بے خودی کے بجائے جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوتے ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملتِ اسلامیہ کا جداگانہ تشخص از سرِ نو مستحکم ہو گیا، اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں جسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیت حاصل ہے دینِ محمدیؐ بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے بقول علامہ اقبالؔ مرحوم:

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار!

سلسلۂ نقشبندیہ جس کا پودا سرزمینِ ہند میں حضرتِ مجددؒ کے مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسلِ طریقت میں سے اقرب الی الشریعت ہے، اور حضرت مجددؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرت مجددؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصہ ہے اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ باقویہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا لیکن "ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی" کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرت مجددؒ کے احفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش اور ردِّ بدعت و رفض کے جرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی از سرِ نو